ریختہ کُتب مرکز بیگ راج
1،2،3 اور برائے خواتین
اُردو ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)
بیگ راج: - 92-307-7002092+

انصار احمد شیخ
استاد، شعبہ اُردو،
جامعہ کراچی

سعادت حسن منٹو اور سماجی حقیقت نگاری

ABSTRACT

Social Realism and Saadat Hassan Manto
by Dr. Ansar Ahmed Shiekh, Department of Urdu, University of Karachi

Through its many dimensions, Urdu fiction has portrayed social issues quite well. The bitter realities of life have been at the centre of realism in Urdu fiction. In the domain of Urdu short story, Saadat Hasan Manto has perfected this art while using the technique of Social realism. His short stories have been based on the realistic approach towards human society. His tactful insight of human character had paved the way for his analysis. In his short stories, he has represented almost all dimension of life such as relationship of man against man and society. In this article, the researcher has analyzed the art of Manto and the use of social realism in his short stories.

سعادت حسن منٹو (۱۹۵۵ء-۱۹۱۲ء) ہماری ادبی تاریخ کا انتہائی اہم اور ناقابلِ فراموش فرد ہے۔ ادبی دنیا میں ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کی حیثیت کئی حوالوں سے ہے۔ ادبی اُفق پر وہ ایک مترجم، خاکہ نگار، افسانہ نگار، ڈراما نویس، مضمون نگار اور مکتوب نگار کے طور پر اُبھرے اور ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کے ان مٹ نقوش ثبت کر دیے، لیکن جس صنف نے انھیں منفرد مقام اور ابدیت و آفاقیت بخشی، وہ نثری ادب کی مقبول ترین صنفِ افسانہ نگاری تھی۔ منٹو نے اپنے تخلیقی شعور اور ذہنِ رسا سے اعلیٰ تخلیقات کے ذریعے اردو افسانے کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ افسانوی ادب پر منٹو کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اردو افسانے کی تاریخ اس بارِ احسان سے کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔

اردو افسانے میں پریم چند سے لے کر منٹو تک سماجی حقیقت نگاری کے رُجحان کو بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس درمیانی عرصے میں جدید ادب کی ''ترقّی پسند تحریک'' نے اس کی مقبولیت میں گراں قدر اضافہ کیا۔ بعد ازاں ترقّی پسند تحریک اور سماجی حقیقت نگاری لازم و ملزوم ہو گئے۔ منٹو نے بھی زیادہ تر سماجی حقیقت نگاری کے تحت ہی اپنے افسانوں کی بلند و بالا عمارت تیار کی ہے، جس میں رنگا رنگ رُجحانات نے اس کے حسن کو دو چند کر دیا ہے۔

منٹو اردو ادب میں ایک بڑے حقیقت نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً تین سو افسانے اور دو سو کے لگ بھگ خاکے، مضامین اور ریڈیائی فیچر لکھے۔(۱) آپ نے افسانہ نگاری میں بیک وقت کئی موضوعات پر طبع

آزمائی کی، اور جن جن موضوعات پر قلم اُٹھایا، اُن سب کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ اسی طرح فنِ افسانہ نگاری میں انھوں نے حقیقت نگاری کی تمام خصوصیات کی مکمّل پاسداری کی ہے۔ منٹو کی حقیقت نگاری ماقبل اور معاصر حقیقت نگاری سے اپنا ایک الگ امتیازی نشان قائم کرتی ہے۔ یعنی منٹو سے قبل کی حقیقت نگاری کا تصوّرِ حقیقت کی تصویری پیش کش یا منجمد ترجمانی کا مفہوم رکھتا تھا، جس میں کسی شے کو محض اُس کے بالائی یا ظاہری حال میں دیکھنے دکھانے کا عمل ملتا تھا۔ جب کہ منٹو نے حقیقت کو سیّال یا نامیاتی حالت میں جاننے، پرکھنے اور اُس کی داخلی و خارجی جہات کو باہم دگر آمیز کر کے دیکھنے کی سعی کی۔ (۲) جس سے اُن کی تخلیقات میں نت نئی حقیقتوں کے اظہار کا ایک مؤثّر اور نرالا انداز سامنے آتا ہے۔ اُن کے ہاں سیاسی، سماجی معاشی اور تہذیبی سطح پر زندگی کے بھاری بھرکم موضوعات اور پہلوؤں کی سچّی تصویروں میں ہر سمت حقیقت کی گہری چھاپ موجود ہے۔ یہ تمام تصویریں حقیقت نگاری کے زیرِ اثر ہیں۔ زندگی کے تلخ و شیریں موضوعات کی عکس ریزی کر کے انھوں نے حقیقت نگاروں کے گروہ میں اپنا نام درج کرایا ہے۔ منٹو کی افسانہ نگاری کی وساطت سے اُن کی حقیقت نگاری کی خصوصیات کا باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کے ہاں حقیقت نگاری کی کوئی ایک مخصوص قسم نہیں ہے، بلکہ ادب میں رائج حقیقت نگاری کی کم و بیش تمام اقسام منٹو کے یہاں مِل جاتی ہیں۔ سماجی، سیاسی، اشتراکی، رومانی اور تنقیدی حقیقت نگاری وغیرہ کے ذریعے انھوں نے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی جیتی جاگتی کتھا مرتّب کی ہے، لیکن ان سب میں سماجی حقیقت نگاری کا رجحان سب پر حاوی ہے، جس نے کتنے ہی رُجحانات کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔

سعادت حسن منٹو نے جس عہد میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، وہ تراجم کے عروج کا دور تھا۔ منٹو نے اپنے ادبی سفر کا آغاز روزنامہ ''مساوات'' کی کالم نگاری سے کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے اسی اخبار ''مساوات'' کا فلمی خبروں کا ایک کالم سنبھال لیا۔ (۳) اخباری کالم نگاری نے منٹو کے حوصلوں کو جِلا بخشی، اور پھر وہ ترجمے کی جانب متوجّہ ہوئے۔ وکٹر ہیوگو کے ناول کا ترجمہ: ''سرگذشتِ اسیر'' ۱۹۳۳ء کی اشاعت نے منٹو کو صاحبِ کتاب بنا دیا تھا۔ (۴) بعد ازاں ترجمے کا یہ سلسلہ چل نکلا اور پھر تواتر سے روسی افسانوں کے تراجم کرنا شروع کر دیے، جو حامد علی خاں کے ممتاز اور موٴقر ادبی رسالہ ''ہمایوں'' میں شائع ہوتے رہے۔ (۵) یوں انھوں نے کم عمری ہی میں بہ حیثیت مترجم ادبی دنیا میں اپنی شناخت کروالی اور اسی عرصے میں منٹو نے رسالوں کے روسی اور فرانسیسی نمبر (۶) مرتّب کر کے ادب میں اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کی مہر ثبت کر دی۔ ترجمہ نگاری کے ساتھ مغربی ادب کے براہِ راست اور عمیق مطالعے سے منٹو کے ابتدائی دور کے افسانوں پر گورکی، گوگول، چیخوف، موپاساں اور وکٹر ہیوگو کے کچھ نہ کچھ اثرات مرتّب ہوئے ہیں۔ اِنھی مغربی مصنّفین کی طرح منٹو کو بھی انسانی رویّوں کے تہہ بہ تہہ حقائق کو کھولنے میں بڑا ادرک حاصل تھا۔ چناں چہ منٹو نے بھی سماجی زندگی کے اچھے بُرے، صاف ستھرے اور کثیف و غلیظ

پہلوؤں کو اس طرح بیان کیا کہ اُس کے سارے نشیب وفراز ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ تقسیم سے قبل تک کے افسانوں میں انھوں نے موضوعی اعتبار سے ضرور کچھ نہ کچھ اخذ و استفادہ کیا ہے، لیکن مجموعی طور پر اُن کے افسانے اپنی ایک الگ انفرادیت و شناخت رکھتے ہیں۔ جس طرز اور جدّت پسندی کو انھوں نے آخر تک اختیار کیے رکھا، وہ صرف اُنھی سے مخصوص رہا۔

سعادت حسن منٹو نے افسانہ نگاری کا آغاز سیاسی موضوعات سے کیا۔ اُن کا اوّلین مجموعہ ''آتش پارے'' ۱۹۳۶ء مکمّل سیاسی رُجحان کی غمّازی کرتا ہے۔ ایک مبتدی کی اس اوّلین کاوش میں واضح سیاسی اور سماجی شعور جھلکتا ہے۔ اِسی احساس کے زیرِ اثر وہ اُونگھتے ہوئے معاشرے کو جگانا چاہتے تھے۔(۷) خوابِ غفلت میں پڑے لوگوں کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے۔ منٹو کا یہ واحد افسانوی مجموعہ ہے، جس کے کسی بھی افسانے میں جنس کا شائبہ تک نہیں ہے، البتّہ اس ابتدائی مجموعے میں وہ فن کارانہ چابک دستی، سلیقہ مندی اور پختہ کاری بھی عنقا ہے، جو بعد کے تمام افسانوی مجموعوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ منٹو کے اس مجموعے کے تقریباً تمام افسانوں میں انقلاب اور مزدور کی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ نچلی سطح کے مزدور طبقے سے جذباتی ہمدردی، جذباتی وابستگی اور جذباتی کیفیات کو کئی افسانوں میں اُبھارا گیا ہے۔ خاص کر ''خونی تھوک''، ''تماشا''، ''دیوانہ شاعر'' اور ''انقلاب پسند'' میں انقلابی جوش بہت نمایاں ہے۔ ہر افسانے میں باغیانہ لب ولہجہ اور دردمندانہ انداز ملتا ہے۔ دراصل یہ دور سیاسی ابتری اور کش مکش کا تھا۔ انھوں نے کروٹیں لیتے ہوئے اس عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کو کئی افسانوں کی زینت بنایا۔ اُن کے بعد کے دور کے دیگر افسانے: ''۱۹۱۹ء کی ایک بات''، ''نیا قانون''، ''نعرہ''، ''سوراج کے لیے''، ''خونی تھوک''، ''کالی شلوار'' وغیرہ بھی اُس دور کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ سیاسی نظام کے خلاف نفرت، جلیانوالا باغ کا حادثہ، مارشل لا، سیاسی تحریکیں اور حصولِ آزادی کے واقعات وغیرہ کے بارے میں اُن کا ردِعمل خاصا اشتعال انگیز ہے۔ منٹو نے اپنے اوّلین افسانوی مجموعے کے انتہائی مختصر دیباچے میں ان افسانوں کو دبی ہوئی چنگاریاں بتایا ہے اور اُمید کی ہے کہ قارئین بھی پڑھنے کے بعد انھیں شعلوں میں تبدیل کردیں گے۔(۸) جلیانوالہ باغ کے اس خونی حادثے کے وقت سعادت حسن منٹو صرف سات برس کے تھے۔ انھوں نے یہ حادثہ اپنے والد کے ہمراہ بہ چشم خود دیکھا تھا۔ ۱۹۱۹ء کا یہ حادثہ منٹو کے تحت الشّعور میں محفوظ ہوگیا تھا۔ ''خلق'' کے اگست ۱۹۳۳ء کے شمارے میں اُن کا افسانہ ''تماشا'' شائع ہوا(۹) اُس کا موضوع یہی جلیانوالا باغ تھا، جو اُن کے لاشعور سے شعور میں در آیا۔ ''تماشا'' کا خالد اور ''خونی تھوک'' کا قُلی کا ردِعمل درحقیقت منٹو کی روح کا شعلۂ انتقام واحتجاج تھا، جو اُن کے دوسرے دور کے کچھ افسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔ البتّہ بعد کے تمام مجموعوں میں متانت، سنجیدگی اور فنی پختہ کاری نمایاں ہے۔ منٹو کے تخلیقی، فنّی اور فکری شعور نے بہت تیزی سے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ سماجی تبدیلی کا گہرا احساس روزِ اوّل ہی سے اُن کی سرشت میں

موجود تھا، رفتہ رفتہ یہ احساس فزوں تر ہوتا گیا، جسے منٹو نے سماجی حقیقت نگاری کے پیرائے میں بے رحم سماجی تضادات کو بغیر کسی جذباتیت اور انتہا پسندی کے اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔

منٹو کی سماجی حقیقت نگاری میں انفرادیت کی جو تصویر اُن کی تحریروں سے ذہن میں اُبھرتی ہے، وہ اُن کی زندگی کے پس منظر سے بھی نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اوائل عمر ہی سے زندگی کے ہر شعبے میں سب سے منفرد نظر آنے کے متمنی تھے۔ منٹو کی اپنی اور احباب کی تحریریں اس جذبے کی گواہی دیتی ہیں کہ محض منفرد نظر آنے کی خاطر منٹو نے شعبدہ باز ماسٹر اللہ رکّھا کے اعلان پر بھرے مجمعے میں برہنہ پا دہکتے ہوئے انگاروں پر چلنا گوارا کر لیا۔ طرح طرح کی عجیب وغریب طفلانہ افواہیں پھیلا کر لوگوں کی توجّہ کا مرکز بننا، اُن سے خراجِ تحسین حاصل کرنا، منٹو کا محبوب ترین مشغلہ رہا۔ (۱۰) جو رفتہ رفتہ اُن کی رگ وپے میں سرایت کر گیا اور پھر بعد ازاں زندگی بھر اُن کے ساتھ رہا۔ لہٰذا انھوں نے ایک منفرد مصنّف اور منفرد شخصیت کے طور پر نظر آنے کے لیے ساری زندگی یہ شعوری کوشش کی کہ وہ حیرت انگیز اور غیر معمولی کام انجام دیتے رہیں کہ جس سے وہ ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں۔ اس کے لیے انھوں نے افسانوں میں سنسنی خیزی پھیلانے اور چونکانے و متحیّر کر دینے کا بیڑا اُٹھایا اور اس کام کو انھوں نے سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے انجام دیا۔ جسے وہ خوش اسلوبی اور کامیابی سے ذمّے دارانہ انداز میں تا دمِ آخر نبھاتے رہے۔

منٹو نے اپنے ادبی سفر کا آغاز جو ایک انسان پرست افسانہ نویس کی حیثیت سے کیا تھا، بعد ازاں اُنھوں نے رفتہ رفتہ ایک سماجی حقیقت نگار کا رُوپ دھار لیا۔ منٹو نے کسی پردے یا لیبل کا سہارا لیے بغیر ہمیشہ بے باکی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ (۱۱) وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی سماجی حقیقت نگاری میں بے رحمی اور بے خوفی در آئی اور اُن کا فن زیادہ سے زیادہ سفّاک ہوتا گیا۔ منٹو کے مزاج میں جو بے باکی، تلخی، تُرشی اور دُرشتی پائی جاتی ہے، وہ اُن کی شخصیت کے ساتھ اُن کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ حمید شاہد کی دانست میں منٹو اپنی تحریروں میں بسا اوقات اتنا زہر بھر دیتے ہیں، جیسے خون میں اُتر کر سارے بدن کو نیلا تھوتھا بنا دیا گیا ہو۔ (۱۲) اور کشور ناہید کو منٹو کے قہقہوں میں بھی زہر نظر آتا ہے۔ (۱۳) درحقیقت منٹو جوذکی الحس واقع ہوا تھا۔ ملک کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی ابتر صورتِ حال نے منٹو جیسے حسّاس ادیب کو زیادہ جھنجھوڑ دیا تھا۔ سماجی ناانصافی اور معاشرتی تضاد نے اُن کے افسانوں میں طنز کے ساتھ تلخی کو بھی شامل کر دیا تھا۔ اُن کے قلم کی یہ تلخی، چُبھن اور نشتریت دراصل اُن کے عہد میں مرد وزن کا استحصال، اُن کی حق تلفی، لوٹ کھسوٹ، سماجی منافقت، ریاکاری اور خباثتوں کو دیکھ کر در آئی ہے۔ سماجی رشتوں کے کھوکھلے پن پر تیر ونشتر کے بھرپور وار کرنے کے ساتھ اُن کے یہاں سماجی زندگی کا گہرا تجزیہ بھی ملتا ہے۔ اُن کے افسانوں کی بڑی تعداد اسی سماجی حقیقت نگاری کے ضمن میں آتی ہے۔ منٹو، افسانہ نگاری کے میدان میں مخصوص طرز کی بنا پر سب سے الگ تھلگ تنِ تنہا انفرادی شان کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ اِنھی کے توسّط سے سماجی حقیقت نگاری نے برسوں کا

سفر دنوں میں طے کیا ہے۔ بلا شبہ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔

منٹو نے فنِ افسانہ نویسی میں سماجی حقیقت نگاری کے تقاضوں کو اس طور نبھایا ہے کہ جس کے وہ واقعتاً مستحق تھے۔ اِسی بنا پر ان کی معمولی سے معمولی کہانی بھی فن کارانہ چابک دستی اور ہنر مندی کا کامل ثبوت پیش کرتی ہے۔(۱۴) روز مرّہ زندگی کی جتنی چیزوں کو انھوں نے اپنے فن پاروں کے لیے ضروری سمجھا، اُن میں سے بھی کڑا انتخاب کیا۔ اُن کی کہانیوں میں صرف کردار ہی حقیقت کا نقشہ نہیں کھینچتے، بلکہ اُن کے افعال و اعمال، کہانی کا زبان و بیان، جزئیات وتفصیلات، مناظر و ماحول وغیرہ سب مل کر جیتی جاگتی حقیقتوں کی کہکشاں بنا دیتے ہیں، جو کہانی کے موضوع اور حالات وواقعات سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔

منٹو کی سماجی حقیقت نگاری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ظاہر کے بجائے باطن پر اپنی توانائیاں زیادہ صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے کردار جو معاشرے کی نظر میں مردود وملعون اور نا قابلِ التفات ٹھہرتے ہیں۔ جن کی حیثیت سماج کے لیے کوڑے کرکٹ اور غلاظت کے سوا کچھ اور نہیں ہے، وہ اس غلاظت اور کچرے کے ڈھیر سے ہماری اخلاق باختگی اور ہماری خام کاری کے نشانات کو ڈھونڈتا ہے، وہ اس تعفّن کو محض ہمیں سیدھی راہ دکھانے کے لیے گوارا کرتا ہے۔(۱۵) اکثر اوقات منٹو گندگی، غلاظت اور کُوڑے کے ڈھیر سے ہمارے لیے نیکی، خیر اور حُسن کے اجزا نکال لاتا ہے، اور کبھی اُس کے اندر سے پاک صاف، مطہر اور منوّر انسانی فطرت کو برآمد کرتا ہے۔ یہ اُس کے فن کی خاص انفرادیت ہے کہ وہ کبھی انسان سے نا اُمید نہیں ہوتا۔

> ''یہ منٹو کا میدان ہے، وہ دنیا کی ٹھکرائی گھورے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چُن کر نکال لاتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اُسے شوق ہے۔ کیوں کہ دنیا کے سنوارنے والوں پر اُسے بھروسا نہیں۔'' (۱۶)

منٹو اردو کا وہ واحد افسانہ نگار ہے، جو زندگی کے تناظر میں جنس کی حقیقت کا بھرپور شعور رکھتا ہے، اُنھوں نے اپنی تخلیقات میں جنس کا مبلّغ بننے کی کبھی کوشش نہیں کی، بلکہ ہماری سماجی زندگی میں انسانی رشتوں ناتوں کے مابین مختلف جنسی رویّوں سے جو پیچیدگیاں اور الم ناکیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اُن سب کی وضاحت منٹو نے حقیقت پسندانہ انداز میں کی ہے۔ لذّت سے تہی جنس کو انھوں نے ہمیشہ سماجی پس منظر میں ذمّے داری کے ساتھ برتا ہے۔(۱۷) اردو افسانے کے جنسی رُجحانات میں معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی عورت ''طوائف'' کا بھی بڑا عمل دخل رہا ہے۔ صدیوں پر محیط سماجی اقدار اس کی رہینِ منّت رہی ہیں۔ اردو ادب میں طوائف کی زندگی کو مرزا رسوا، پریم چند، قاضی عبدالغفّار، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی، غلام عبّاس، رحمان مذنب وغیرہ نے موضوع بنایا ہے، مگر منٹو کی اس موضوع پر جدّت طرازی، خیال انگیزی اور سماجی حقیقت پسندی سب سے منفرد ہے۔ انھوں نے اپنے ہاں کسی

ایسی طوائف کو جگہ نہیں دی جو تہذیبی کردار کی پروردہ ہو۔(۱۸) بلکہ منٹو کے یہ متنوّع کردار عصری تناظر میں اپنی حقیقی اور جیتی جاگتی صورتوں میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں طوائف کی زندگی پر منٹو سے بہتر افسانے کسی نے نہیں لکھے۔ منٹو نے جنس کو سماج کے وسیع پس منظر میں بیان کیا ہے۔ دراصل جنسی حقیقت نگاری، سماجی حقیقت نگاری ہی کا ایک جزو ہے۔(۱۹) یقیناً جنسی موضوعات میں سب سے نازک اور حسّاس موضوع یہی طوائف کا ہے۔ اچھے اچھے قلم کار اس مخلوق پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں، لیکن اس ضمن میں منٹو کا کارنامہ یہ ہے کہ اس طبقے کی ترجمانی میں نہ تو اُن کے قدم ڈگمگائے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی غلاظت میں وہ لت پت ہوئے ہیں، بلکہ بڑے سلیقے اور قرینے سے حقیقت پسندانہ انداز میں ان کی زندگی کے تلخ اور تاریک پہلوؤں کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کر دیا ہے۔ بلاشبہ طوائف، خود منٹو کا ایک بہت بڑا موضوع ہے اور ایک درجن سے زائد کامیاب افسانے لکھ کر اس موضوع پر اپنی فنّی گرفت کا ثبوت بھی فراہم کر دیا ہے۔ منٹو اس موضوع پر اگر صرف ایک ہی افسانہ ''ہتک'' لکھ دیتے، تو وہ انھیں افسانہ نگاری کے میدان میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا، لیکن انھوں نے اسی ایک افسانے پر اکتفانہ کیا۔ کیوں کہ وہ مختلف زاویوں سے معاشرے کے استحصال زدہ عورت کا صرف ایک روپ دکھا کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ''ہتک'' کے علاوہ حقیقت میں رنگے ان کے افسانوں ''کالی شلوار''، ''ممی''، ''جانکی''، ''خوشیا''، ''بابو گوپی ناتھ''، ''فوبھا بھائی''، ''دس روپے''، ''۱۹۱۹ء کی ایک بات''، ''سوکینڈل پاور کا بلب'' اور ''شانتی'' وغیرہ میں اس ہستی کے مختلف زاویوں سے متنوّع رنگ وروپ سامنے آئے ہیں۔ منٹو نے سوگندھی، سلطانہ، کانتا، ممی (نائکہ)، شانتی، زینت، جانکی، سریتا وغیرہ جیسے مختلف کرداروں کے ذریعے طوائف کے ہر طرح کے رنگ ڈھنگ کو ہمارے سامنے لا کر اُن کی تہہ میں پوشیدہ کرب اور بے چارگی و بے بسی وغیرہ کو نمایاں کیا ہے۔ طوائف پر لکھے گئے منٹو کے یہ افسانے درحقیقت دردوگداز کے جیتے جاگتے مرقّع ہیں۔ ان افسانوں میں حالات وواقعات کے تناظر میں اُن کی زندگی کے جو نقشے کھینچے گئے ہیں، وہ اس قدر پُراثر ہیں کہ ایک مدّت تک ذہنوں پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے تمام افسانوں میں منٹو نے مختلف سماجی مسائل کو پیش کیا ہے اور بنی نوع انسان کی ذہنی اور نفسیاتی اُلجھنوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ طوائف سمیت اس قبیل کی دیگر عورتوں کی تصویر کشی کے بعد سماج کا جو رُوپ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اُس میں عورت کی تنہائی، رنج والم اور گہرے اضطراب کی کیفیت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے، اس کے باوجود غلط سماجی نظام اور مکروہ ذہنیت کے طفیل یہ ٹھکرائی ہوئی اور زخم خوردہ عورتیں سماج میں قبول نہ ہونے کے سبب اپنے مقام سے کُوسوں دُور غلیظ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ لہٰذا ایسے مقامات پر منٹو کا قلم اس مخلوق کی ہمدردی کے لیے متحرک ہو جاتا ہے اور پھر قاری بدی کے اس مجسم پیکر سے نفرت کرنے کے بجائے اپنے قلب وروح میں اُس کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہے۔ اردو افسانے میں پہلی بار طوائف کے موضوع پر اس طرح ہمدردانہ انداز میں روشنی ڈالی

گئی ہے کہ قارئین کے دل میں بھی اس طبقے کی عورت کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ''بابو گوپی ناتھ'' کی 'زینت'، ''دس روپے'' کی 'سریتا'، ''کالی شلوار'' کی 'سلطانہ'، ''ہتک'' کی 'سوگندھی'، ''موذیل'' کی 'موذیل'، ''ممی'' کی 'ممی'، ''شاردا'' کی 'شاردا'، ''سراج'' کی 'سراج' اور 'جانکی' کی 'جانکی' وغیرہ میں اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ اُن کے دیے ہوئے یہ زندۂ جاوید کردار اب ہمارے اجتماعی حافظے سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ انھی کرداروں کے توسّط سے انسانی ہمدردی اور محبّت کا جذبہ بیدار کرنا منٹو کا سب سے بڑا کمال ہے اور اُن کی سماجی حقیقت نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت بھی۔ اس موضوع پر منٹو کے افسانے اُن کی سلیقہ مندی اور احتیاط پسندی کے مظہر ہیں۔ انسان کی مختلف کیفیتوں اور جنسی رویّوں کو موضوع بنانے کے باوجود بھی ان کی تحریروں میں فحاشی اور عریانی کی فضا نہیں ملتی، لیکن اس مساعی کے باوجود منٹو پر بعض ترقّی پسندوں نے الزام تراشیوں اور دشنام طرازیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔(۲۰) معاشرتی صداقتوں اور حقیقتوں کے اظہار کو رجعت پسندانہ اور مریضانہ ٹھہرایا گیا۔ اس متعصّبانہ سوچ سے قطعِ نظر منٹو کا مطمحِ نظر زندگی کی ایک واضح، مکمّل اور نئی تصویر کو پیش کرنے کا تھا، اس تصویر کشی اور زندگی کے حقیقی تاثر کو اُبھارنے کے لیے وہ اپنا مخصوص اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اپنے اس خاص انداز اور خاص طرز کے بارے میں انھوں نے خود ہی انکشاف بھی کر دیا کہ جو لوگ اُسے سیاہ قلم کہتے ہیں، لیکن وہ تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے کبھی نہیں لکھتا، ہمیشہ سفید چاک ہی استعمال کرتا ہے، تاکہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ واضح اور نمایاں ہو جائے۔(۲۱) چناں چہ منٹو بےباکی اور جرأت مندی کے ساتھ تختۂ سیاہ پر اپنے معاشرے کی بے راہ رویوں کو اقتصادی، نفسیاتی اور سماجی تناظر میں مختلف زاویوں سے رقم کرتا رہا۔ اس طرح ہماری زندگی کی بعض اہم اور بنیادی حقیقتیں طشت از بام ہو گئی ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں صرف بدنام طبقے کی ٹھکرائی ہوئی مفلوک الحال آبرو باختہ عورتوں ہی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ہر طبقے کی عورت اور مرد کا ذکر تفصیل سے اُن کے افسانوں میں بکھرا پڑا ہے۔ بیس ویں صدی کے سماجی سیاسی شعور اور تقاضوں کے نتیجے میں منٹو نے عورت کے بنتے بگڑتے تصوّر اور کردار کی کجیوں پر خود بھی احتجاج کیا ہے اور عورت کو بھی اس پر اکسایا ہے۔ منٹو کے ہاں عورت کے حوالے سے سماجی عیبوں کی نشان دہی سے اس کی تمنّاؤں کی حرارت کو باآسانی محسوس بھی کیا جاسکتا ہے۔(۲۲) منٹو نے اس ضمن میں کسی بندھے ٹکے نظریے یا مقصد کے حصول کے تحت افسانے نہیں لکھے۔ وہ جب سماج میں پھیلی ہوئی شدّت پسندی، بھوک، افلاس، تنگ دستی، زبوں حالی، ذلّت ورسوائی، ذہنی ونفسیاتی اُلجھنیں، باعصمت اور عصمت باختہ عورتوں کے رویّے، اُن کی مجبوریاں، مظلومیت وغیرہ کو کُھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، تو اُس سے اِغماض نہیں برتتے، بلکہ وہ کسی رنگ آمیزی کے ان حقیقتوں کو پوری سچّائی کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ منٹو کے گناہ آلود معاشرے میں عورت کئی رنگ وروپ میں موجود تھی۔ منٹو کی دوربین نگاہ ان سب تک پہنچی ہے۔ ایک جانب اُن کی تخلیقات میں عورت مہر، وفا، ایثار، الّھڑ، فرض شناس،

دردمند، نیک سیرت، غمگسار، معصوم اور مثبت خوبیوں کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اُس کا سماجی مقام و مرتبہ بڑا واضح، صاف اور کھُل کر سامنے آتا ہے۔ اُن کے افسانوں کی عورت زندگی کا ازلی کرب اپنے سینے میں اُٹھائے ایک عام فرد کی حیثیت سے اپنی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ مختلف رشتوں ناتوں کی صورت میں رنج والم اور کرب بھی سہتی ہے۔ ''خدا کی قسم''، ''شاہ دولے کا چوہا''، ''اولاد'' اور ''سڑک کے کنارے'' وغیرہ افسانوں میں خلوص و محبّت کے ساتھ مامتا کی فراوانی کے ساتھ ایک ماں کا کرب کیا ہوتا ہے، سامنے آتا ہے۔ درحقیقت اُسے یہ درد، کرب، ذلّت، بے بسی، مجبوری، محرومی اور بے چارگی سونپنے والا معاشرہ ہی ہے، جس نے ان گنت سیاسی، تہذیبی اور معاشی مسائل اُس کی جھولی میں ڈال کر سماج کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ دوسری جانب منٹو کے افسانوں میں عورت کا دوسرا رُخ سنگ دل، منتقم، بے خوف، ایذا کوش، شہوانی حیوان، شوخ و شنگ اور خودغرض کے رُوپ میں بھی اُبھرا ہے۔ عورت کے اس دوسرے رُخ کا مطالعہ بھی منٹو نے معاشرتی نظام میں اُس کی حیثیت اور فکر کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ ایسی عورتیں بنا کسی جبر کے ان خباثتوں کی مرتکب ہوئی ہیں۔ ان میں شعوری بُرائیاں ہیں۔ ان کا وجود سماج کی نظروں میں شرم و ندامت کا باعث ہوتا ہے۔ نفسیاتی اثرات بھی کبھی ان خرابیوں کا محرّک بنتے ہیں اور وہ حالات کے دھارے پر بہہ کر از خود رفتہ ہوجاتی ہیں۔ منٹو کی اس قبیل کی عورتوں میں ''رکما''، ''ہلاکت''، ''کلونت کور''، ''لتیکا رانی''، ''بشریٰ''، ''زینب'' اور ''پھندنے'' کی بے نام ہیروئین شامل ہیں۔ یہ سب اخلاق باختہ عورتیں منٹو کے نفسیاتی مطالعے کا موضوع بنی ہیں۔

منٹو کے یہاں کوئی بھی موضوع کبھی بھی سماجی نظام سے ہٹ کر کسی الگ صورت میں اپنی تفہیم نہیں کراتا۔ ان کے افسانوں کے تمام موضوعات کو سماجی زندگی ہی سے کشید کر کے اُسے نئے نئے زاویوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ منٹو کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اُن کے قدم زندگی کے متضاد پہلوؤں، انسانی رویّوں، نفسیاتی الجھنوں کو پیش کرنے میں اُٹھنے لگے تھے، پھر منٹو کا یہ سفر وسعت، پھیلاؤ اور ندرت اختیار کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ البتّہ سماجی اور نفسیاتی حقیقتوں کو مختلف اندازِ فکر کے ساتھ بیان کرنے کا سلسلہ آخر تک برقرار رہتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر بھی لکھے گئے اُن کے افسانے نت نئے رنگوں کا احساس اُبھارتے ہیں۔ ہر افسانہ زندگی کے حسن و قبح کی کوئی نہ کوئی نئی انوکھی شکل دکھاتا ہے۔ انسانی فطرت کی کوئی نہ کوئی تفسیر پیش کرتا ہے۔ اس کے لیے منٹو نے نفسیات کا بھی خوب سہارا لیا ہے۔ چناں چہ اُن کے افسانوں میں ہر عمر کے افراد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا خلاصہ ملتا ہے۔ ذہنی اُلجھنیں اور ناروا پابندیاں بعض اوقات انسانی زندگی کے لیے سمِّ قاتل ثابت ہوتی ہیں۔ منٹو نے عنفوانِ شباب میں قدم رکھنے والے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی انھی نفسیاتی کیفیات کو ''پھاہا''، ''بلاؤز''، ''شوشو'' اور ''دھواں'' میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں منٹو نے نفسیات کو اپنا بنیادی موضوع بنا کر کم سِنی کی بیداری کو گہری

نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کے علاہ نفسیاتی حقیقتوں کی ترجمانی میں اُن کے افسانے ''پڑھیے کلمہ''، ''ننگی آوازیں''، ''پہچان''، ''ڈرپوک''، ''دھواں''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''کالی شلوار''، ''کھول دو''، ''ہتک'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔انسانی نفسیات کی تہہ در تہہ متعدّد پرتوں کو ان افسانوں کے ذریعے کھولا گیا ہے۔نفسیاتی مطالعے میں انھوں نے انتہائی گہری نظر کا ثبوت دیا ہے اور بعض اوقات ان پر ایک ماہرِ نفسیات کا گمان ہوتا ہے۔نفسیاتی حقائق کی گرہ کُشائی میں ایک افسانہ نگار پر کیا کیا ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں۔وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر تھے۔

منقولہ بالا عورتوں کی طرح اُن کے افسانوں کے ایسے مردانہ کردار بھی ہیں، جو انسان اور شیطان کی شکل میں ان گنت معائب و محاسن کا مجموعہ ہیں، وہ سب اسی سماجی ماحول کے پروردہ ہیں۔جس میں انسان ہر لمحے ہر آن نیکی اور بدی سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔بالخصوص سماج کی بُرائیاں بعض اوقات اُس میں اتنی رچ بس جاتی ہیں کہ فرد کے لیے اُن سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہوتا۔منٹو انسان کی فطری معصومیت کے ساتھ ساتھ انسان کی خباثت، حیوانیت اور شر کی قوّتوں کی بھی بسیط آگہی رکھتا ہے۔(۲۳) اِسی آگاہی کے طفیل انھوں نے انسانی آوارگی، بے راہ روی، ذلالتوں اور ریاکاریوں کے کسی نہ کسی رُوپ کو اپنے افسانوں میں ظاہر کر دیا ہے، تاکہ معاشرہ قبل از وقت ایسے افراد کی بیخ کنی کر سکے۔مرد ذات کی کج رویوں اور فریب کاریوں کو ''اللہ دتا''، ''بدتمیز''، ''خورشٹ''، ''تقی کاتب''، ''کتاب کا خلاصہ''، ''میرا نام رادھا ہے''، ''شاداں''، ''پانچ دن''، ''پڑھیے کلمہ'' اور ''سونورل'' جیسے افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ان کے افسانوں کی بنیادی خصوصیت یہی ہے کہ اُس میں ہمیں سماجی زندگی کے گہرے مشاہدے کے ساتھ فطرتِ انسانی کا عمیق مطالعہ ملتا ہے۔وہ ہمیں یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کسی مخصوص صورتِ حال میں کیا رویّہ اختیار کر سکتا ہے یا کرے گا، ظالم اور مظلوم میں کیا کیا قدریں مشترک ہیں اور کون سی مخالف۔(۲۴) منٹو انسان کی ان بدلتی ہوئی حالتوں اور طبعی میلانات کو دیکھنے اور دکھانے کی کوششوں میں تمام عمر مصروفِ عمل رہے۔اِسی مساعی میں وہ انسان کے تحت الشعور کی وادیوں تک پہنچ گئے تھے۔انھوں نے کرداروں کے ذہن اور روح میں اُتر کر اُن کے ایک ایک راز کو جاننے کی کوشش کی ہے۔منٹو اپنے کرداروں کی ان کمزوریوں، خامیوں، مجبوریوں اور بدعنوانیوں کی پردہ دری کرنے کے ساتھ ساتھ اکثر و بیش تر اُن کے باطن میں جھانک کر الم ناکی اور نیکی کو بھی باہر لے آتے ہیں۔کرداروں کی یہ دردمندی، نیکی کی کرن اور انسانیت کی رمق ان کے افسانوں میں اس قدر حاوی ہوتی ہے کہ فطری انسان کی حیوانیت اور شیطانیت پر خود بخود دبیز پردے پڑ جاتے ہیں۔''بابو گوپی ناتھ''، ''سہائے''، ''ممد بھائی''، ''دودا پہلوان''، ''رام سروپ'' اِسی نوع کے کردار ہیں۔جس میں ایثار و قربانی کی روشنیاں اپنا نور پھیلاتی نظر آتی ہیں۔کردار نگاری اور سماجی حقیقت پسندی کے حوالے سے ''بابو گوپی ناتھ'' منٹو کا شاہ کار افسانہ ہے۔ان کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں موجود کردار، واقعات اور مسائل دیکھے بھالے سماج سے تعلق

رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں شہری زندگی کے جس سماج کا ذکر ہوا ہے، وہ بیسویں صدی کے وسط کا تیزی سے بدلتا ہوا ماحول ہے۔ مختلف شہروں (بمبئی، دہلی، لاہور) میں زندگی بسر کرنے اور ملازمتوں کے دوران وہ اس سماج سے جوجھتے بھی رہے ہیں۔ منٹو کے ان تجربات اور مشاہدات نے اُن کے ذہنی اُفق کو بہت وسیع کیا ہے۔ اس لیے اُن کے افسانے یقین کی حد تک حقیقت کا تاثّر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اُن کے ہر افسانے میں سماج کی کوئی نہ کوئی حقیقت اُبھرتی ہے اور ضرو بالضّرور زندگی کا کوئی نہ کوئی رمز سامنے آتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سماجی مسائل اور کردار کی نفسیاتی حالت کو اُس کی معاشرت سے منسلک کرکے اُسے ایک جیتی جاگتی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ منٹو اوّل و آخر ایک سماجی حقیقت نگار ہے۔

منٹو کے بارے میں ایک عام تاثر یہی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں جنسی رُجحان کا سب سے بڑا مبلّغ ہے۔ اُس کے تمام افسانوں میں اسی رُجحان کی گونج سُنائی دیتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ منٹو کے کچھ ہی افسانے اس میلان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کے زیادہ تر افسانوں میں سماجی رُجحان کے ساتھ جو سیاسی رُجحان کارفرما نظر آتا ہے، اُسے یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ منٹو نے اس سیاسی رُجحان کے زیرِ اثر تقسیم کے بعد بھی متعدّد افسانے سُپردِ قلم کیے ہیں۔ جن سیاسی حالات میں برِّصغیر کی تقسیم ہوئی تھی، اُس میں بڑے پیمانے پر لوگوں نے نقل مکانی کی تھی۔ اسے اگر تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دونوں اطراف کے لوگوں نے آگ اور خون کے دریا عبور کیے۔ اس دوران نفرتوں کے بوئے ہوئے بیج نے لاکھوں انسانوں کو موت کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس سیاسی کھیل میں انسانوں کی جو تذلیل ہوئی، تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والے فسادات نے ہندو پاک کی سیاسی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ سیاسی رُجحان کے تحت فسادات کے موضوع پر متعدّد افسانہ نگاروں نے ان گنت افسانے لکھے۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے مشاہدات، تجربات و احساسات کی بنیاد پر قاری کو ظلم وقساوت کی وہ بھیانک تصویریں دکھائیں کہ جنھیں پڑھنے کے بعد قاری کا انسانیت پر سے ایمان اُٹھ جائے۔ تقسیمِ ہند کے ایسے نازک موقع پر کم وبیش ہر افسانہ نگار نے فسادات کے موضوع پر افسانے لکھے تھے، لیکن ان میں سے چند ہی مقبولِ عام ہو سکے تھے۔ حیات اللہ انصاری کا ''شُکر گزار آنکھیں'' اور ''ماں اور بیٹا''، قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا''، بیدی کا ''لاجونتی''، کرشن چندر کا ''ہم وحشی ہیں''، اوپندر ناتھ اشک کا ''ٹیبل لینڈ''، اشفاق احمد کا ''گڈریا''، عصمت چغتائی کا ''جڑیں''، خواجہ احمد عبّاس کا ''سردار جی'' اور عزیز احمد کا ''کالی رات'' وغیرہ موضوعاتی اور فنّی اعتبار سے عمدہ افسانے ہیں۔ بے شک یہ افسانے اپنے عہد کے موضوعاتی لحاظ سے کامیاب قرار دیے جا چکے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محوّلہ بالا افسانہ نگاروں کے صرف ایک یا دو افسانوں ہی نے مقبولیت حاصل کی۔ سعادت حسن منٹو اس ضمن میں اس لیے ممتاز و منفرد ہیں کہ تقسیمِ ہند، ہجرت اور فسادات کے حوالے سے اُن کے تقریباً بیس افسانے منظرِ

عام پر آئے۔(۲۵) اور افسانچوں کا مجموعہ ''سیاہ حاشیے'' اِس پر مستزاد ہے۔ اِن میں منٹو کے ایک یا دو کے بجاے درجن بھر افسانے مقبولِ عام ہوئے۔ منٹو نے نہ صرف ہجرت کا کرب سہا، بلکہ متعدّد واقعات کے وہ چشم دید گواہ بھی تھے۔ لہٰذا فسادات اور ہجرت کے موضوع پر لکھتے وقت انھوں نے دیگر افسانہ نگاروں کی طرح چشمِ تصوّر کی بجائے زیادہ تر چشمِ بینا کو اہمیت دی۔ چناں چہ اس دور میں انھوں نے بہت سے افسانے اسی خاص پس منظر میں لکھے ہیں۔ ''سیاہ حاشیے'' (افسانچوں کا مجموعہ)، ''سہائے''، ''رام کھلاون''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''کھول دو''، ''عزت کے لیے''، ''ہرنام کور''، ''سوراج کے لیے''، ''ڈارلنگ''، ''شریفن''، ''گورمکھ سنگھ کی وصیّت''، ''۱۹۱۹ء کی ایک بات''، ''موتری''، ''خدا کی قسم''، ''موذیل''، ''وہ لڑکی''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''ٹیٹوال کا کتّا''، ''آخری سلیوٹ''، ''جاؤ حنیف جاؤ'' وغیرہ اسی قبیل کے افسانے ہیں۔ آخری الذّکر تینوں افسانوں کا پس منظر کشمیر ہے۔ ان افسانوں میں بالعموم ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور بالخصوص فسادات، تقسیم اور ہجرت کو براہِ راست اور پس منظر میں بھی موضوع بنایا گیا ہے اور فسادات کے بعد کی سیاسی اور نفسیاتی صورتِ حال بھی ان افسانوں میں موضوع بنی ہے۔ دیگر افسانہ نگاروں کی نسبت اُن کے افسانے واقعاتی صداقتوں کے حامل تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ فسادات کے اس بحرِ بیکراں سے منٹو نے وہ جواہر پارے نکالے ہیں کہ جس پر اس سے قبل کسی کی نگاہ نہیں گئی تھی۔ ممتاز شیریں اِن افسانوں کی یوں تحسین کرتی ہیں:

> ''منٹو کے یہ افسانے اتنے مختصر، اتنے چست، اتنے گھٹے ہوئے ہیں، کہ ان میں ایک لفظ بھی زیادہ یا کم نہ ہوسکتا تھا۔''(۲۶)

منٹو نے سیاسی رُجحان کے تحت جن افسانوں میں فسادات کو موضوع بنایا ہے۔ اُس میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر اس بات کو مدِّنظر رکھا ہے کہ وہ اس بھیڑ میں اپنی جداگانہ حیثیت کو منوا سکیں، اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کر سکیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ منٹو نے اس ضمن میں اپنا حق ادا نہ کیا ہو۔ ''سیاہ حاشیے'' کی مختصر ترین کہانیاں اور مذکورہ بالا افسانے انسانی مظالم کا زبردست نوحہ ہیں۔ صدیوں سے محبّت و آشتی کے ساتھ رہنے والوں کے درمیاں مذہبی منافرت نے چند سالوں میں اُن کو ایسا پتھر دل بنا دیا کہ انسان کشی پر وہ ذرا بھی نہ ہچکچائے۔ منٹو نے ان میں انسانی اعمال کی انفرادی اور اجتماعی سطح پر بربریت کے ہولناک منظر دکھائے ہیں۔ جنھیں پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ فسادات کے دنوں میں انسانوں کے جذبۂ انتقام نے کیا کیا روپ دھارے اور ان کی نفرت و حقارت جذبے کی تسکین کے لیے حیوانیت اور درندگی کی کس سطح پر پہنچی۔ منٹو نے ان تمام کیفیات کی ترجمانی بڑے دردمندانہ انداز میں غیر جانبداری کے ساتھ کر دی ہے۔ ایسے عالم میں منٹو نے بعض افسانوی کرداروں میں نیکی اور شرافت کی ہلکی سی کرن بھی دکھا دی ہے۔ جس نے انسانیت کی لاج رکھ لی ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کا ایشر سنگھ، ''رام کھلاون'' کا رام کھلاون، ''شریفن'' کا قاسم وغیرہ انسانیت کو رُسوا ہونے سے بچانے کی عمدہ مثالیں ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں کی عظیم الشّان اور بلند و بالا عمارت کسی سیاسی مسلک سے وابستگی کے بغیر تعمیر کی تھی۔ اپنی افسانہ نگاری کے بائیس سالہ سفر میں وہ سرزمینِ ادب کو بصیرت و ادراک اور فکر و فن کا ایک ایسا بے مثال اور ان مول افسانوی ذخیرہ دے گئے کہ جس کو نشانِ راہ بنا کر اُن کے بعد کی نسلیں ایک متعین اور صحیح سمت کی جانب چل پڑیں۔ اردو افسانے کے ارتقا میں سماجی زندگی کی حرارت سے بھرپور منٹو کی کہانیاں اُن کے معاصرین کے لیے بھی سنگِ میل ثابت ہوئیں، لہٰذا مجموعی حیثیت میں اُن کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی، سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے، انسانیت کی تکریم اور قدر میں مضمر تھی۔ انھوں نے انسانیت اور انسان دوستی کو مقدّم جانتے ہوئے افسانہ نگاری کے ہر موڑ پر دردمندی کے ساتھ اُس کی عزّت و توقیر کی۔ اِسی بصیرت نے انھیں عظیم المرتبت اور قابلِ رشک مقام پر پہنچایا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ایسا عالی مقام و مرتبہ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں کسی دوسرے کو حاصل نہ ہوسکا۔

حواشی:

(۱) حامد جلال، کالا دودھ، مشمولہ: منٹو ایک کتاب، مرتّبہ: صہبا لکھنوی (کراچی: مکتبۂ افکار، طبعِ اوّل: ۱۹۹۴ء)، ص ۴۵۷۔

(۲) مبین مرزا، سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن (پاکستان، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۰۱۔

(۳) سعادت حسن منٹو، آغا حشر سے دو ملاقاتیں، مشمولہ: گنجے فرشتے (لاہور: مکتبۂ شعر و ادب، سنہ ندارد)، ص ۳۷۔

(۴) یہ ترجمہ ہے۔ فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو کی کتاب کا نام ہے: "The Last Day of a Condemned Man"
مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: سعادت حسن منٹو، سرگذشتِ اسیر (دیباچہ)، مشمولہ: باقیاتِ منٹو، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۱۔۹۔

(۵) باری علیگ، چند مہینے امرتسر میں، مشمولہ: سعادت حسن منٹو ۱۹۱۲۔۱۹۵۵، (ادارہ ندارد، ترتیب: ضیا ساجد)، ص ۱۹۰۔۱۹۱۔

(۶) ہمایوں مئی ۱۹۳۵ اور عالم گیر کے روسی ادب نمبر مرتّب کیے، بعد ازاں ستمبر ۱۹۳۵ء میں ہمایوں کا فرانسیسی ادب نمبر بھی مرتّب کیا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر برج پریمی، منٹو کتھا (جموّں: دیپ پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۲۴۲۔۲۱۶۔

(۷) طاہرہ اقبال، منٹو کا اسلوب۔ افسانوں کے حوالے سے (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء)، ص ۹۵۔

(۸) سعادت حسن منٹو، آتش پارے (لاہور: مکتبۂ شعر و ادب، سنہ ندارد)، دیباچہ۔

(۹) ڈاکٹر علی ثنا بخاری، سعادت حسن منٹو۔ تحقیق (لاہور: منٹو اکادمی، اشاعتِ اوّل: مئی ۲۰۰۶ء)، ص ۱۳۹۔

(۱۰) حامد جلال، محولہ بالا، ص ۴۵۳۔

(۱۱) ممتاز مفتی، سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے، مشمولہ: سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے، ترتیب و تعارف: احمد سلیم (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۴۱۔

(۱۲) محمد حمید شاہد، سعادت حسن منٹو۔ جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ (کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۰۔

(۱۳) کشور ناہید، منٹو کے نسوانی کردار اور آج کا پاکستان، مشمولہ: منٹو کا آدمی نامہ، ترتیب: آصف فرخی، (کراچی: شہرزاد، دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۱۷۴۔

(۱۴) وارث علوی، دو ادیب۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی (لاہور: شاہد پبلی کیشنز، سنہ ندارد)، ص ۱۰۰۔

(۱۵) ڈاکٹر اے بی اشرف، کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۸۳۔

(۱۶) عصمت چغتائی، میرا دوست میرا دشمن، مشمولہ: نقوش، منٹو نمبر، ۴۹، ۵۰ (لاہور: ادارۂ فروغِ اردو، سنہ ندارد) مرتب: محمد طفیل، ص ۳۰۲۔

(۱۷) ڈاکٹر کہکشاں پروین، منٹو اور بیدی۔ تقابلی مطالعہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اشاعتِ اوّل: ۲۰۰۲ء)، ص ۳۶۔

(۱۸) مبین مرزا، محولہ بالا ص ۹۱۔

(۱۹) ممتاز شیریں، معیار (لاہور: نیا ادارہ، باراوّل: ۱۹۶۳ء) ص ۱۱۴۔

(۲۰) عزیز احمد نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جنس نے منٹو کے یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ترقی پسند ادب (حیدرآباد دکن: ادارۂ اشاعتِ اردو، طبعِ اوّل: مارچ ۱۹۴۵ء) ص ۲۰۰۔

(۲۱) سعادت حسن منٹو، ادبِ جدید، مشمولہ: ادبِ لطیف، جلد ۱۸، شمارہ ۴، ۵ (۱۹۴۴ء) ص ۴۱۔۴۲۔

(۲۲) ڈاکٹر روش ندیم، منٹو کی عورتیں، مشمولہ: سعادت حسن منٹو۔ منٹو صدی: منتخب مرتبین: مبین مرزا، ڈاکٹر رؤف پاریکھ (پاکستان: مقتدرہ قومی زبان، طبعِ اوّل: ۲۰۱۱ء) ص ۶۴۳۔

(۲۳) وارث علوی، منٹو۔ ایک مطالعہ (اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، طبعِ اوّل: جنوری ۲۰۰۳ء) ص ۱۱۹۔

(۲۴) صائمہ ارم، منٹو کے افسانوں میں ہجوم کی نفسیات، مشمولہ: سعادت حسن منٹو۔ پچاس برس بعد (لاہور: جی سی یونی ورسٹی، باراوّل: ۲۰۰۵ء)، مرتبین: شمشیر حیدر شجر، نوید الحسن، ص ۱۶۴۔

(۲۵) شمیم حنفی، منٹو: حقیقت سے افسانے تک (کراچی: شہرزاد، اشاعتِ اوّل: دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۲۴۲۔

(۲۶) ممتاز شیریں، فسادات پر ہمارے افسانے، مشمولہ: نیا دور، کراچی (فسادات نمبر)، مرتب: صمد شاہین، ۱۶۔ (۱۷ مارچ ۱۹۴۹ء)، ص ۵۲۵۔

مآخذ:

۱۔ احمد، عزیز، ترقی پسند ادب، حیدرآباد دکن: ادارۂ اشاعتِ اردو، طبعِ اوّل: مارچ ۱۹۴۵ء۔

۲۔ ارم، صائمہ، منٹو کے افسانوں میں ہجوم کی نفسیات، مشمولہ: سعادت حسن منٹو۔ پچاس برس بعد، مرتبین: شمشیر حیدر شجر، نوید الحسن، لاہور: جی سی یونی ورسٹی، باراوّل: ۲۰۰۵ء۔

۳۔ اشرف، اے بی، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔

۴۔ اقبال، طاہرہ، منٹو کا اسلوب۔ افسانوں کے حوالے سے، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء۔

۵۔ بخاری، علی ثنا، ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو۔ تحقیق، لاہور: منٹو اکادمی، اشاعتِ اوّل: مئی ۲۰۰۶ء۔

۶۔ پروین، کہکشاں، ڈاکٹر، منٹو اور بیدی۔ تقابلی مطالعہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اشاعتِ اوّل: ۲۰۰۲ء۔

۷۔ پریمی، برج، ڈاکٹر، منٹو کتھا، جمّوں: دیپ پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

۸۔ جلال، حامد، ''کالا دودھ''، مشمولہ: منٹو ایک کتاب، مرتّبہ: صہبا لکھنوی، کراچی: مکتبۂ افکار، طبعِ اوّل: ۱۹۹۴ء۔

۹۔ چغتائی، عصمت، ''میرا دوست میرا دشمن''، مشمولہ: نقوش (منٹو نمبر) مرتّب: محمّد طفیل، ۴۹، ۵۰، لاہور: ادارۂ فروغِ اردو، سنہ ندارد۔

۱۰۔ حنفی، شمیم، منٹو: حقیقت سے افسانے تک، کراچی: شہرزاد، اشاعتِ اوّل: دسمبر ۲۰۱۲ء۔

۱۱۔ شاہد، محمّد حمید، سعادت حسن منٹو۔ جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ، کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۳ء۔

۱۲۔ شیریں، ممتاز، فسادات پر ہمارے افسانے، مشمولہ: نیا دور، کراچی، فسادات نمبر، مرتّب: صمد شاہین، ۱۶۔۱۷، مارچ ۱۹۴۹ء۔

۱۳۔ شیریں، ممتاز، معیار، لاہور: نیا ادارہ، بار اوّل: ۱۹۶۳ء۔

۱۴۔ علوی، وارث، دو ادیب۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، لاہور: شاہد پبلی کیشنز، سنہ ندارد۔

۱۵۔ علوی، وارث، منٹو۔ ایک مطالعہ، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، طبعِ اوّل: جنوری ۲۰۰۳ء۔

۱۶۔ علیگ، باری، چند مہینے امرتسر میں، مشمولہ: سعادت حسن منٹو ۱۹۱۲۔۱۹۵۵، ترتیب: ضیا ساجد، ادارہ ندارد۔

۱۷۔ مرزا، مبین، سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن، پاکستان، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء۔

۱۸۔ مفتی، ممتاز، سعادت حسن مرگیا، منٹو زندہ ہے، مشمولہ: سعادت حسن مرگیا، منٹو زندہ ہے، ترتیب و تعارف: احمد سلیم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

۱۹۔ منٹو، سعادت حسن، آتش پارے، لاہور: مکتبۂ شعر و ادب، سنہ ندارد۔

۲۰۔ منٹو، سعادت حسن، آغا حشر سے دو ملاقاتیں، مشمولہ: گنجے فرشتے، لاہور: شعر و ادب، مکتبۂ سنہ ندارد۔

۲۱۔ منٹو، سعادت حسن، ادبِ جدید، مشمولہ: ادبِ لطیف، جلد ۱۸، شمارہ ۵، ۴، ۱۹۴۴ء۔

۲۲۔ منٹو، سعادت حسن، سرگذشتِ اسیر (دیباچہ)، مشمولہ: باقیاتِ منٹو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

۲۳۔ ناہید، کشور، منٹو کے نسوانی کردار اور آج کا پاکستان، مشمولہ: منٹو کا آدمی نامہ، ترتیب: آصف فرّخی، کراچی: شہرزاد، دسمبر ۲۰۱۲ء۔

۲۴۔ ندیم، روش، ڈاکٹر، منٹو کی عورتیں، مشمولہ: سعادت حسن منٹو۔ منٹو صدی: منتخب مضامین، مرتّبین: مبین مرزا، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، پاکستان: مقتدرہ قومی زبان، طبعِ اوّل: ۲۰۱۱ء۔